ڈاکٹر صلاح الدین درویش٭
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، اسلام آباد

اُردو کی ابتدا کے سیاسی نظریات

Dr. Salah uddin Derwesh
Department of Urdu, Govt. College H/9,Islamabad

The Political Theories about the Birth of Urdu

The scholars of Urdu language and literature have presented different theories about the origin of Urdu language and literature in the Sub-Continent of India. The researcher has presented in this research article only the political ideas about the origin of Urdu language and literature by critically analysing the eight different histories of Urdu language and literature written by the eminent scholars of Urdu. The method was qualitative and the analytical approach was used. The majority of scholars have a political view about the origin of Urdu language and literature in the Sub-Continent of India. They strongly believe that Urdu language and literature has originated and spreaded as the result of the Muslim Invaders and Invasions the researcher is of the view that this conception of the scholars is due to their political attachments; where as Urdu language and literature has evolved as the result of the interaction among different local and regional languages of the Sub-Continent of India. Certainly, there is a fairly good vocabulary of Arabic, Turkish and Persian Languages in Urdu, but the over all structures of Urdu language are on the patterns of Indian local and regional languages.

کسی بھی خطے کی تاریخ میں وہاں کے سیاسی حالات و واقعات اور اس نوع کی تبدیلیاں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔ سیاسی حالات کا براہِ راست اثر معاشرت اور معیشت کی مختلف پرتوں پر پڑتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے امن وسکون کا عرصہ معاشرتی زندگی میں بھی امن وسکون اور اُس میں نکھار پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ علمی، ادبی، تخلیقی و دیگر ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور تفریحی اشغال میں بھی اضافہ ہوتا ہے، ان حالات کا براہِ راست اثر معیشت سے متعلق امور پر بھی پڑتا ہے اور ترقی وخوشحالی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ بعض سیاسی تبدیلیاں اچانک پوری معاشرت کو زیروزبر کردیتی ہیں اور بعض تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے اثرات آہستہ آہستہ ہماری تمدنی زندگی میں سرایت کرتے رہتے ہیں۔ ہر دوصورتوں میں تہذیبی اقدار وروایات میں تبدیلی کا عمل بہت سست رہتا ہے۔ حکمرانوں یا حکم ناموں کے بدلنے سے تہذیبی زندگی میں تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوجاتی۔ تہذیب انسانی زندگی سے متعلق لوگوں کے اجتماعی تصور کا نام ہے جو صدہا برسوں کی تپسیا کے بعد خاص نتائج کی کم وبیش حتمیت کو قبول کرلیتا ہے۔ اس اجتماعی تصور یا اقدار وروایات کے خاص مجموعے سے انحراف دراصل خود زندگی سے انحراف سمجھا جاتا ہے۔ پس سیاسی تبدیلیاں تہذیبی عمل میں تبدیلی پر زیادہ کارگر نہیں ہوتیں، زبان بھی تہذیبی زندگی کی ایک ایسی ہی قدر ہے، اس میں تبدیلی کے لیے سماج کی تمام تر معاشی، ثقافتی، سیاسی، علاقائی، جغرافیائی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کا تسلسل درکار رہے۔ اسی طرح کوئی زبان نہ تو محض سیاسی تبدیلیوں کے تابع اچانک ظہور پذیر ہونا شروع ہوجاتی ہے اور نہ ہی کسی زبان کے ارتقاء کو کسی علاقے یا خطے کی محض سیاسی تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ زبان کا ارتقاء پوری معاشرت کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت ارتقا سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو زبان کی ابتداء سے متعلق جب ہم مختلف نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بڑی اہمیت کی حامل بن جاتی ہے کہ ان میں سے بیشتر نظریات سیاسی بنیادوں پر استوار کیے گئے ہیں اور محض سیاسی تبدیلیوں کے ہمدوش اُردو زبان کے ارتقاء کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو زبان کی ابتدا سے متعلق سیاسی نظریہ سازوں میں سب سے اہم ترین نام پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کا ہے، اُنھوں نے اپنے نظریے کو اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ کے آئینے میں اُردو زبان کے آغاز وارتقاء سے بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب میں اس بات پر تقریباً نہ ہونے کے برابر توجہ دی ہے کہ مسلمان حملہ آوروں کی فتح سندھ ۷۱۲ء سے لے کر غزنوی حکمرانوں کی فتح پنجاب ۱۰۲۱ء تک اور پھر فتح پنجاب سے لے کر فتح دلی ۱۱۹۳ء تک کم وبیش پورے شمالی ہند میں مختلف ثقافتی ولسانی گروہوں کے درمیان ہم آہنگی کن بنیادوں پر قائم تھی؟ اُن کے درمیان معاشی اور سماجی تعلقاتِ کار کا نظام کیسا تھا؟ ذرائع پیداوار کس نوع کے تھے؟ سیاسی معاملات کو سلجھانے کے لیے کن اصولوں کی پاسداری کی جاتی تھی؟ وہ لسانی تنوع کی موجودگی میں صدہا سال سے آپسی تعلقات کس طرح نبھاتے تھے؟ کیا واقعی شمالی اور جنوبی ہندوستان میں بولی جانے والی مختلف زبانیں، پراکرتیں، دیسی بولیاں، عوامی بولیاں، اپ بھرنشیں یا دیگر معروف زبانیں ایک دوسرے سے بہت دور تھیں یا وہ ایک دوسرے کے اثرات سے محفوظ یا ناآشنا تھیں یا پھر ان تمام زبانوں اور عوامی بولیوں کے درمیان یگانگت کو برقرار رکھنے والی کوئی ایک یا ایک سے زائد زبانیں

مسلمان حملہ آوروں سے پہلے بھی موجود تھیں۔ محمود شیرانی کی تحقیق میں ان سوالات کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان جنگجوؤں کا قافلہ جیسے جیسے شمالی ہند سے جنوبی ہند کی طرف بڑھتا گیا ویسے ویسے اُردو زبان بھی اپنی ابتداء اور ارتقاء کے مدارج بہ سہولت طے کرتی گئی۔

۱۱۹۳ء میں دلی کی فتح کے بعد جب قطب الدین ایبک دلی کے تخت پر براجتا ہے تو اُس کے لشکریوں میں ایک بڑا گروہ ایسا بھی شامل ہے کہ جس کا تعلق پنجاب سے تھا لیکن اس گروہ کی پنجابی میں عربی، فارسی اور ترکی کے اثرات کم و بیش گذشتہ ڈیڑھ صدی میں کافی حد تک پڑ چکے تھے۔ افواج کے ساتھ ساتھ زبان کے اس سفرنامے کو محمود شیرانی نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

> قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آ گئے ہیں اگرچہ یوں تو اُن میں مختلف اقوام شامل تھیں، مثلاً ترک جو بڑے عہدوں پر ممتاز تھے، خراسانی جو مناصبِ دیوانی پر سرفراز تھے، خلجی، افغان اور پنجابی۔ لیکن ان میں زیادہ تعداد مؤخر الذکر کی تھی جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر بھی متصرف تھے۔ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے، ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اور چونکہ پنجاب میں بنی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔ بہر حال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں کہ جس کو قیامِ پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے ہیں۔ (۱)

درست شواہد یا حقائق کی عدم دستیابی ایک مسئلہ ہو سکتی ہے، لیکن مذکورہ اقتباس میں محمود شیرانی نے ایک قیاسی کہانی بیان کی ہے۔ زبانیں حکمران طبقات کے ساتھ سفر نہیں کرتیں بلکہ حکمران طبقات کو اپنی زبان کے تحفظ کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دربار خواہ ترک بادشاہوں کا تھا یا فارسی بولنے والوں کا، اُنہوں نے اٹھارویں صدی عیسوی تک شمالی ہند میں اپنی زبان کو نا صرف برقرار رکھا بلکہ علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کو اپنی شان و شکوہ کے منافی گردانا۔ جنوبی ہند کے بیجا پور اور گولکنڈہ عہد میں اگر بیشتر دربار سرکار کی زبان مقامیت کے ہمہ گیر اثرات سے متصف تھی اور فارسی کے متوازی حکمرانوں نے ہندی، ہندوی یا دکنی کو اختیار کیا تو اِس کی وجہ شمالی کی فارسیت کے متوازی اپنی مقامی لسانی شناخت کا دفاع تھا۔ یہ حکمران بھی فارسی بولنے والے تھے لیکن شمال کے حکمرانوں سے محاذ آرائی اور علیحدگی کے بعد اُن کے اقتدار کو بامِ عروج تک پہنچانے کے لیے اب صرف مقامی تہذیب و معاشرت اور زبان ہی کام میں لائی جا سکتی تھی پس اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور دکن میں بہمنی دور سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن تک دکنی اُردو نے اظہار کا وہ اسلوب اختیار کر لیا کہ شمالی ہند کی نظم و نثر ابھی تک اُس کے مخصوص ذائقے سے محروم تھی۔ شمالی ہند کی اُردو ابھی کسی ولی دکنی کے دیوان کی دلی میں آمد کی منتظر تھی۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سے لے کر سقوط گولکنڈہ اور بیجا پور تک کے پورے دکنی ادب کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس میں ہمیں ہندی و سنسکرتی

روایت کے پہلو بہ پہلو دیگر مقامی زبانوں، خصوصاً تلنگی، کنڑی اور مرہٹی کے اثرات بھی فروغ پذیر دکنی پر بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک عربی اور فارسی الفاظ بھی مقامی زبانوں سے ہم رنگ ہو گئے۔ یہ دکنی یا دکنی اُردو ایک تہذیب کے اسیر اور پروردہ تھی۔ یہ تہذیب ان کی قومی شناخت بھی تھی اور لسانی شناخت بھی۔ یہ محض رابطے کی زبان نہیں تھی بلکہ ایک پوری تہذیب کا آئینہ تھی۔ تیمور کے حملوں سے جب دلّی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی اُس عہد میں دکنی تہذیب و معاشرت امن و خوشحالی کے عروج تک پہنچ چکی تھی، فخر دین نظامی کی مثنوی ۱۴۳۵ء میں جب تصنیف ہوئی، شمالی ہند میں اُردو زبان ابھی ریختہ کے مرحلے پر تھی۔ نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے ٹکر کی افضل کی ''بکٹ کہانی'' شمالی ہند میں کہیں ۱۶۲۵ء میں جا کر منظرِ عام پر آتی ہے۔ یاد رہے کہ ''بکٹ کہانی'' شمالی ہند کا پہلا دستیاب ادبی شہکار ہے۔ جبکہ اس عہد تک آتے آتے جنوبی ہند میں امین الدین اعلیٰ، شوقی، نصرتی، صنعتی، مقیمی، قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ابن نشاطی، فائز اور طبعی جیسے شعراء اور نثر نگار منظرِ عام پر آ چکے تھے اور اپنے کمالات دکھا چکے تھے۔ یہ تمام شعراء دکنی تہذیب و تمدن کے نمائندے تھے جبکہ شمالی ہند میں اُردو ابھی تک رابطے کی زبان کی سطح پر تھی۔ یہ ہنوز اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے لکھاریوں کی راہ تک رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ، ملتان، لاہور، دلی اور گنگا جمنی تہذیبی و ثقافتی اکائیاں اپنے ارتقاء میں محض مسلمان حکمرانوں کی محتاج نہ تھیں۔ یہ سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی اکائیاں صدہا سال کی تاریخ رکھتی تھیں۔ ان سب کی اپنی اپنی شناخت جو صدیوں پیشتر موجود تھی وہ آج بھی موجود ہے۔ ان میں بولی جانے والی زبانیں جو عوامی رابطے اور ثقافتی ایکتائی کا موثر ترین وسیلہ تھیں، تختِ لاہور کا تھا یا دلّی کا، یہ ثقافتی اکائیاں اپنے متنوع رنگ روپ میں ہمیشہ برقرار رہیں۔ دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے کے باوجود یہ آج بھی اپنی قومیتی شناخت رکھتی ہیں۔ اپنے لباس، زبان، روایات، اقدار، تعمیرات، نشت و برخاست اور قیام و طعام میں اپنی اپنی شناخت کے مخصوص حوالے رکھتی ہیں۔ اُردو اپنے اندر کوئی ایسی عالمگیر تہذیب نہ رکھتی تھی کہ جو ان تمام ثقافتی اکائیوں کی شناخت کو کھا جاتی اور اپنے رنگ میں رنگ لیتی۔ لیکن حافظ محمود شیرانی کا اردو کے حوالے سے سیاسی نظریہ حقائق کے اس دوسرے رخ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب میں اُردو بولی، پڑھی، سمجھی اور لکھی جاتی ہے لیکن پنجاب کی غالب زبان پنجابی ہے اور تہذیب و معاشرت بھی پنجابی ہے۔ اقبال اور فیض اسی زبان اور تہذیب کے نمائندے ہیں لیکن اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اُنہوں نے اُردو کو زیادہ موزوں جانا تا کہ ان کے حلقہ اثر کو وسعت ملے یوں اُردو لسانی رابطے کا کام دیتی ہے نہ کہ تمدنی اور ثقافتی رابطے کا۔ اسی طرح میؔر دلی کے جن کوچوں کو اوراقِ مصور قرار دیتے ہیں، وہ دلّی کے تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں، وہ خود دلی کے ہیں اور زبان بھی دلی کی بولتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اگر چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے بڑے بڑے گروہ جن میں سرکاری اہلکار، فوجی، شاعر، ادیب، صوفیاء، علماء اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے حضرات پنجاب سے دلی کی طرف ہجرت نہ کرتے تو گویا اُردو زبان بھی پنجاب سے ہجرت کرنے میں ناکام رہتی۔ یعنی پنجاب میں بولی جانے والی مقامی زبانیں بشمول ترکی، فارسی اور عربی کے، پنجاب کی مقامی آبادیوں میں تو اردو کو مقامی سطح پر رواج نہ دے پائیں لیکن دلی کے قیام میں

دیکھتے ہی دیکھتے دو تین سو سالوں میں ایک معیاری اُردو زبان کو فروغ دینے میں کامیاب ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیرانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُردو دلّی کی قدیم زبان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی خطّے میں اگر مختلف زبانیں بولی جا رہی ہوں تو پاس پڑوس کی زبانوں کے ساتھ بعض سماجی سطح پر ضروری لسانی اشتراکات کے باعث ایک ڈھیلی ڈھالی لسانی وحدت کی صورت ہمیشہ موجود رہتی ہے، ایسا نہ ہو تو ہمسایہ معاشرے ایک دوسرے سے بالکل کٹ جائیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی سماج میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسے ہم سادہ الفاظ میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ سندھی کو سرائیکی جاننے والا بہ سہولت سمجھ لیتا ہے، اسی طرح اردو بولنے والا پنجابی کو بہ سہولت سمجھ سکتا ہے گویا لسانی رابطے کی ایک شکل موجود رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فتح دلی سے پیشتر بھی لسانی رابطے کی یہ صورت موجود تھی اور یہ بھی ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ دکن والے دلی کی زبان سے بالکل نا آشنا تھے؟ یعنی مسلمان اگر نہ آتے تو دلی اور دکن کے درمیان رابطے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی!! ظاہر ہے کہ دلی اور دلی کے مضافات میں بولی جانے والی کوئی مقامی پراکرت، برج بھاشا، کھڑی بولی یا ہندی یا ہندوی موجود تھی جو اپنے عواقب و جوانب میں موجود زبانوں کے ساتھ لسانی رابطے کی ایک مؤثر شکل رکھتی تھی۔ یہ زبان جنوبی ہند کی زبانوں سے اُتنی ہی مختلف تھی جتنی پنجابی، سندھی سے مختلف ہے۔ پس ان تمام زبانوں کے درمیان کچھ کچھ مماثلتیں بھی ہیں جو باہمی رابطے میں کام آتی ہیں اور کچھ امتیازی خصوصیات بھی رکھتی ہیں کہ جن کے باعث اپنی سماجی اور ثقافتی شناخت کو نمایاں کرتی ہیں۔ پنجابی اور اردو میں موجود مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے شیرانی کہتے ہیں:

> اُردو اپنی صرف ونحو میں پنجابی اور ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء وافعال کے خاتمے میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے یہاں تک کہ دونوں کے جمع کے جملوں میں نا صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ اُن کے توابعات اور ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اُردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔ (۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ صرفی اور نحوی اعتبار سے یہ مماثلت دلی، میرٹھ اور ان کے مضافات میں بولی جانے والی ہندی، برج بھاشا، کھڑی بولی یا شورسینی پراکرت میں بھی پائی جاتی ہے جو مسلمانوں کے سیاسی اقتدار سے بہت پہلے یہاں مروج تھی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور رام بابو سکسینہ نے بھی اسی بات کی تائید کی ہے۔ مثلاً رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اُس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جسے مغربی ہندی کہنا بجا ہے، زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے گو کہ ''اردو'' کا نام اس زبان کو عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف ونحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی۔ (۳)

ڈاکٹر محی الدین زور نے بھی شمالی ہند میں موجود مقامی زبانوں کے درمیان پائی جانے والے مماثلتوں کی بنیاد پر اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کا نظریہ پیش کیا ہے اور اسے محض مسلمانوں کی فتح پنجاب یا دلی کے ساتھ مشروط نہیں کیا، اُن کے بقول:

> اُردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایا تخت نہ بنالیا۔ اُردو اُس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہندآریائی دور میں اس حصّہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی، مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اُس زبان پر مبنی ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی کیونکہ (نئے) ہندآریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ (۴)

اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی جغرافیائی، ثقافتی وسماجی قرابت کے نظریے کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں اُردو اپنے ابتدائی زمانے میں جس زبان سے قریب تر تھی، وہ دلی اور میرٹھ اور اس کے مضافات کی معیاری زبان، جو ایک مقامی پراکرت کا درجہ بھی رکھتی تھی یعنی پالی تھی۔ اپنے اس نظریے کو انھوں نے اپنی کتاب ''اردو زبان کا ارتقاء'' میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما کو محض مسلمان حملہ آوروں کی آمد کے ساتھ مشروط نہیں سمجھتے۔ وہ قدیم ویدک بولیوں میں رہتے بستے ہوئے ایک معیاری زبان یعنی پالی کو اُردو کا منبع قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر سینتی کمار چڑجی پنجابی اور دلی کی برج بھاشا کو بیک وقت اردو زبان پر اثر انداز ہونے والی زبانیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تینوں زبانیں صوتی اختلافات کے باوجود یکساں ذخیرہ الفاظ کی حامل ہیں لیکن وہ مسلمان فاتحین کی آمد کے بعد شمالی ہند میں اردو کی نئی صورت پذیری کے حوالے سے محمود شیرانی کے ہم خیال ہیں۔

ایک اہم پہلو جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی وہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء سے متعلق مختلف زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کے صوتی اختلافات کی طرف سیاسی نظریات میں زیادہ توجہ دی گئی اور ان اختلافات سے متعلق طویل فہرستیں اپنی کتب میں پیش کی ہیں لیکن جملے کی عمومی ساخت کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان فاتحین کی زبانوں خصوصاً فارسی زبان کے الفاظ کی اُردو زبان میں موجودگی کے ذریعے اُردو کی لسانی تشکیل کو نمایاں کرنا تھا اور پھر اس کی بنیاد پر سیاسی نظریہ قائم کرنا تھا۔ فارسی عبارت یا جملے کی مجموعی نشست مقامی زبانوں بشمول اُردو کل کی طرح آج بھی نامانوس ہے۔ فارسی الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہوئے، اُردو کے قالب میں ڈھل گئے اور اُن سے اجنبیت ختم ہوگئی لیکن یہی الفاظ فارسی نظم ونثر میں جملے یا کسی مصرعے کی ساخت میں اردو پڑھنے والے کے لیے معنوی تفہیم کے حوالے سے معاون یا مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ فارسی زبان کو دیس نکالا اسی حقیقت کے سبب ملا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز جو ۱۳۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، کی

قدیم ترین نثری تصنیف ''معراج العاشقین'' کا مطالعہ آج اکیسویں صدی میں بھی کرتے ہیں تو اُس کے الفاظ، لب ولہجہ اور جملے کی ساخت ہمارے لیے نامانوس نہیں ہے:

> انسان کے پوجنے کوں پانچ تن، ہرایک تن کوں پانچ دروازے ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس' اس کا عمارہ' یعنی واجب الوجود کی آنگ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سُنناسو۔ (۵)

ان جملوں کی ساخت سے واضح ہورہا ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کی موجودگی کے باوجود یہ جملے اور ان کی ساخت مقامی ہے۔ یہ جملے ہندوستان کی ہزار ہا سال کی تہذیبی وتمدنی تاریخ میں رچے بسے اور گندھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اسی عہد کی فارسی نظم ونثر کو اگر دیکھا جائے تو یہ نظم ونثر اُردو زبان کے مقامی رنگ وآہنگ سے میل کھاتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس کے پیچھے ایک اور تہذیب اور تمدن کا رنگ دکھائی دیتا ہے کہ جس سے ہندوستان بھر کی مقامی زندگی اور معاشرت وثقافت اُنسیت کا رشتہ قائم نہ رکھ سکی۔ ہندوستان میں فارسی تہذیب کا غلبہ محض سیاسی ضروریات کی حد تک رہا ہے جبکہ علاقائی سطح پر ثقافتی اکائیاں اپنے اختلافات اور اشتراکات میں بشمول زبان کے اپنی شناختوں کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ شناختیں ہندوستان کی مقامی اور علاقائی شناختیں ہیں اس حوالے سے امیر خسرو کا معروف ریختہ بھی ہمارے سامنے ہے جو لسانی اعتبار سے دو تہذیبوں کی جداگانہ حیثیت کو ہمارے سامنے واضح کرتا ہے:

> شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چوعمرِ کوتاہ
> سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
> یکا یک ازدل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
> کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
> چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں زمہرآں مہ بگشتم آخر
> نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں (۶)

اس ریختے کے پہلے مصرعے کو فارسی زبان سے مکمل طور پر آشنا شخص ہی سمجھ سکتا ہے جبکہ دوسرے مصرعے کو ایک نیم خواندہ عام ہندوستانی یا پاکستانی بہ سہولت سمجھ سکتا ہے۔ ان اشعار کی قرأت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان سمجھ میں آنے والے ذخیرہ الفاظ کے باوجود کسی دوسری تہذیب کی پروردہ ہے جبکہ دوسری زبان اپنی عمومی ساخت میں مقامی تہذیبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

''پنجاب میں اُردو'' کے سیاسی نظریے میں جس محقق نے اُس کی ثقافتی روح کو شامل کیا، اُن کا نام ڈاکٹر جمیل جالبی ہے۔ پاکستان کے علمی وادبی حلقوں میں اُن کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کو گویا سند کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ تاریخ کی یہ کتاب ادبی عقیدے کی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا مواد سماجی علوم کے دیگر شعبوں کے

مخصوص درسی مواد کے عین مطابق ہے۔اس بات کی داد دی جانی چاہیے کہ پاکستان میں ڈاکٹر جمیل جالبی واحد محقق ہیں جنہوں نے شبانہ روز کی محنت سے تا حال تین ضخیم جلدوں پر مشتمل اُردو ادب کی تاریخ کو ایک با قاعدہ اور منظّم نظریاتی اساس فراہم کی ہے۔ایک تنہا انسان کی اس قدر علمی، فکری و تحقیقی جستجو کو دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔یہ دیر تک باقی رہنے والی دستاویز ہے جو اپنی تفہیم اور تنقید میں بہت زیادہ لیاقت کی متقاضی ہے۔

اُردو زبان کی ابتدا سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کے سیاسی نظریے کی ثقافتی اساس کا اندازہ اُن کی کتاب ''تاریخ ادب اُردو'' جلد اول کے تمہیدی کلمات سے لگایا جا سکتا ہے:

> مسلمانوں کا کلچر ایک فاتح قوم کا کلچر تھا جس میں زندگی کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی پوری قوت اور لگن موجود تھی۔اس کلچر نے جب ہندوستان کے کلچر کو نئے انداز سکھائے اور یہاں کی بولیوں پر اثر ڈالا تو ان بولیوں میں سے ایک نے، جو پہلے اپنے اندر جذب و قبول کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی، بڑھ کر اس نئے کلچر کو اپنے سینے سے لگایا اور تیزی سے ایک مشترک بولی بن کر نمایاں ہونے لگی۔ (۷)

فاتح قوم کے کلچر کو زندہ، فعال اور متحرک سمجھنا اور مفتوح قوم کے کلچر کو ساکت و جامد اور پس ماندہ قرار دینا ایک مخصوص سیاسی نظریہ ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اِسی نظریے پر اُردو ادب کی تاریخ کی بنیاد رکھی ہے کہ مسلمان فاتح بن کر آئے اور ہندوستان کے کثیر القومیتی و لسانی کلچر پر دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئے۔ڈاکٹر صاحب بھول گئے کہ یہی نظریہ نو آبادیاتی عہد میں سر سید احمد خان نے بھی پیش کیا تھا۔اپنے تمہیدی کلمات میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> مسلمانوں کے کلچر نے جب اِس تہذیب کے جسمِ ناتواں میں نیا خون شامل کیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ سوتا معاشرہ جاگ اُٹھا ہے اور وہ نئے کلچر کے زندہ تصورات و عقائد، نئے ترقی پذیر فلسفۂ حیات اور نئی زبانوں سے قوت و توانائی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے۔اس عمل میں اس معاشرے کی بے معنی، محدود اور گھٹی ہوئی زندگی میں نئے معنی اور وسعتیں پیدا کر دیں۔ (۸)

ایسی باتیں خواہ جمیل جالبی کہیں یا ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب ''تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات'' میں کہیں، بات ایک ہی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ذرائع پیداوار میں تبدیلی کے بغیر معاشرے میں سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیاں نہیں آتیں۔فاتح اقوام کی ترجیحات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ مفتوح قوم کی ترقی اور خوشحالی میں اپنا کردار ذرائع پیداوار میں نئی تبدیلیاں لا کر ادا کرنے کی کوشش کریں۔ہندوستان میں چودھویں سے اٹھارھویں صدی عیسویں تک کے تاریخ منظر نامے کا موازنہ جب ہم اسی عرصے میں یورپ میں احیائے علوم کی تحریک سے لے کر اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب تک کے آلاتِ پیداوار میں تبدیلیوں اور معاشی سرگرمیوں کے ساتھ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس پورے عرصے میں اس حوالے سے ہندوستان مسلسل بیل کے پیچھے جتا ہوا ہے۔شمالی ہند کے مسلمان فاتحین نے ان پورے چار سو سالوں میں ہندوستان کی حیثیت کو جدید آلاتِ پیداوار کے ذریعے ترقی دینے کے بارے میں کچھ زیادہ سوچ بچار نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب میں جمیل جالبی نے

کہیں بھی اس طرف توجہ دینے کی کوشش نہیں کی۔ مغربی اقوام کے ساتھ تجارتی سودے بازی کی حد تک تعلقات کو اُستوار کیا گیا، لیکن ہندوستان کے زرعی معیشت سے متعلق خود کفالتی نظام میں کسی بھی نوع کی بڑی تبدیلی سے احتراز کی روش اختیار کی گئی اور اسی نظام کو برقرار رکھا گیا۔ ان حالات میں ایسا کہاں ممکن تھا کہ مسلمانوں کے فاتح کلچر کی پیروی میں ہندوستان کا کسان سماج دن رات جُت جاتا۔ ہندوستان کی فاتح قوم کے بڑے بڑے محلات، تفریح گاہوں، حویلیوں اور مقابر کے چاروں جانب جو ہندوستان تھا، وہ غربت وافلاس اور محنت ومشقت کی چکی میں پسا ہوا تھا، یہ ہندوستان صرف اپنا پیٹ بھر سکتا تھا اور صرف پیٹ بھرنے ہی کو اُس کی خوشحالی سمجھ لیا گیا۔ اُس کی غربت اور افلاس کو دور کرنے کی ذمہ داری کسی نے نہ لی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی مقامی ثقافتی اکائیوں پر کسی بھی عہد میں فاتح قوم کا کلچر ہمہ گیر بنیادوں پر اثرانداز نہ ہوسکا۔ فاتح قوم کا کلچر دراصل اشرافیہ کا کلچر تھا جو اپنی چاردیواری میں محفوظ ومامون رہا اور اُس کی زبان بھی اِسی چاردیواری میں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی رہی، ان حدود کے باہر یا تو علاقائی یا مقامی بولیاں اپنی شناخت کو بہت کم تبدیلی کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے تھیں یا اُردو، ہندی، برج بھاشا یا کھڑی بولی تھی کہ جو رابطے کی زبان کے طور پر ہندوستان کی عوامی زندگی میں زبان کی ادائیگی اور تحریر میں ہندوستانی کنیڈے میں پوری طرح اُتری ہوئی تھی۔ یہ اُردو فارسی نہ تھی بلکہ اپنی ساخت میں ہندوستانی تھی۔ فاتح کلچر سے الفاظ کا ذخیرہ ضرور منتقل ہوا لیکن اس کی بناوٹ ہندوستانی ہی رہی۔

حافظ محمود شیرانی کی طرح جمیل جالبی نے بھی اردو زبان کے ارتقائی سفر کو مسلمانوں کی فتح سندھ وملتان، پھر فتح دلی اور پھر فتح گجرات سے لے کر دکن تک کے سیاسی ارتقاء کے ہمدوش بیان کیا ہے، اُنہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان حملہ آوروں کی آمد کے وقت یہاں بسنے والوں کی تہذیب کمزور، پارہ پارہ اور زوال پذیر تھی۔ حالانکہ اُس دور میں بھی ہندوستان کی کوئی مرکزی تہذیب نہ تھی بلکہ یہ مختلف النوع علاقائی ثقافتوں کا مجموعہ تھی، یہ علاقہ اِس حوالے سے اپنی خاص شناخت بھی رکھتا تھا اور یہ شناخت کسی نہ کسی طور آج بھی موجود ہے۔ کیا محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے فتح دکن تک شمال اور جنوب کی تمام علاقائی ثقافتیں اور زبانیں مسلمانوں کی توانا اور حیات آفرین تہذیب میں ضم ہوکر کسی مرکزی تہذیبی دھارے میں شامل ہوگئیں؟ قدیم اور موجودہ ہندوستانی و پاکستانی ثقافتوں کی شناخت اور اُن کی تاریخ اس سوال کا جواب ناں میں دیتی ہیں۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت کا غلبہ ہوا، اُن علاقوں میں بھی لوگ اپنی اپنی ارضی ثقافتوں سے جڑے رہے، انہوں نے فاتحین کے تہذیبی عناصر کو نہ اپنایا البتہ سلطنت کے مرکز میں اِن کی پیروی کرنے والا طبقہ اشرافیہ انتہائی قلیل تعداد میں ضرور موجود رہا۔ خود اِس اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے حکمران، علماء اور دربار سرکار سے وابستہ طبقات میں سے بعض نے نسلی بنیادوں پر مقامی لوگوں (بشمول مقامی مسلمانوں کے) کے مذہبی، نسلی، لسانی، طبقاتی اور ثقافتی حوالوں کو طنز اور تضحیک کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ ایسی صورتحال کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ فاتح تہذیب مقامی ثقافتوں میں رچ بس کر کسی مرکزی تہذیبی دھارے کے رُخ کو متعین کر دیتی۔ اردو بھی کسی مرکزی تہذیب کی نمائندہ نہ تھی بلکہ ہندوستان کی مختلف ثقافتوں کے اجتماعی لسانی اظہار کا ذریعہ تھی۔ اس کی یہ حیثیت آج بھی برقرار ہے۔

عین الحق فرید کوٹی بھی اپنی کتاب ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' میں اسی سیاسی مسئلے سے دوچار ہیں کہ جس کی بنیاد پر مسلمان حملہ آوروں کی تاریخ کے دوش بدوش اُردو زبان کے ملک گیر سفر کو بیان کیا گیا ہے۔ عین الحق فرید کوٹی نے اس حوالے سے حافظ محمود شیرانی ہی کے نظریے کا دفاع کیا ہے اور بتایا ہے کہ برج بھاشا جو مسلمانوں کی آمد کے وقت دلی اور اُس کے گردو نواح میں دور دور تک بولی جارہی تھی اردو زبان اُس سے مشتق نہیں ہے بلکہ یہ پنجابی زبان سے نکلی ہے اور اسی زبان کی صرف و نحو سے بہت قریب ہے۔ وہ اپنے مؤقف کی تائید میں کہتے ہیں:

> جب ہم اُردو زبان کی صرف و نحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف و نحو سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ جہاں اُردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے وہاں اُس کے برج بھاشا سے اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہے۔ (۹)

مندرجہ بالا اقتباس کے پس منظر میں جو سیاسی نظریہ کام کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا جاسکے اور اس بات کی گنجائش نکالی جاسکے کہ مسلمانوں نے پہلا حملہ سندھ پر اور پھر پنجاب پر کیا تھا۔ لہٰذا سندھ کے بعد پنجاب ہی کی زبانیں یعنی ملتانی اور لاہوری یا سرائیکی اور پنجابی اُردو زبان کا پہلا زینہ بنیں۔ عین الحق صاحب نے اس جانب توجہ دینے کی کوشش نہیں کی کہ صرف و نحو کے اعتبار سے مصدر، اسمائے صفت اور واحد جمع بنانے میں برج بھاشا پنجابی سے مختلف کیوں تھی؟ فرید کوٹی نے اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھا کہ ہندوستان بھر کے مختلف علاقوں میں، بولی جانے والی کوئی ایک زبان بسا اوقات صرفی اور نحوی اعتبار سے بھی مختلف ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی زبان کو مختلف طبقات مختلف انداز میں ادا کرتے ہیں لیکن تفہیم کے حوالے سے ایک زبردست مماثلت بھی موجود رہتی ہے۔ خود پنجابی اس کی بہترین مثال ہے۔ پس ہم برج بھاشا اور پنجابی کا لسانی موازنہ جب کرتے ہیں تو ان کے درمیان بھی معنوی تفہیم کے حوالے سے ایک مماثلت موجود ہے۔ اردو نے برج بھاشا سے یکسر آزاد ہوکر اپنی لسانی تشکیل نہیں کی بلکہ دیگر زبانوں کی طرح برج بھاشا نے بھی اُردو کی آبیاری میں اپنے حصّے کا کردار ادا کیا ہے۔ برج بھاشا کو چونکہ سنسکرت کی بگڑی ہوئی ایک شکل سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے مورخین نے اپنے سیاسی نظریات کی بنت میں سے اسے خارج کرنے کی کوشش کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ برج بھاشا شمالی ہند سے باہر کی زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کے مرکز یعنی دلی کی زبان تھی۔ اُردو کے علاوہ کوئی اور بھی زبان ہوتی تو اس سے اپنا دامن نہ بچاپاتی۔ سنسکرت اگرچہ متروک ہوگئی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اسی زبان میں دنیا کا عظیم ادب تخلیق ہوا۔ عین الحق فرید کوٹی نے اُردو کی عظمت کے مقابلے میں سنسکرت کے جو عیب بیان کیے ہیں، اُن کی موجودگی میں حیرت ہوتی ہے کہ اس زبان میں ادب کے اعلیٰ نمونے کیسے ظہور پذیر ہوئے؟ یہ زبان ایسی ہی بُری تھی تو ہندوستان بھر کی پراکرتوں میں اس کے الفاظ کی بھرمار کیسے ہوگئی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بہمنی دور کی اُردو بھی سنسکرتی الفاظ اور لب و لہجے سے کافی حد تک متاثر ہے۔ فخر دین نظامی ہو یا شاہ میراں شمس العشاق دونوں کے ہاں اُردو زبان میں سنسکرتی رنگ جھلکتا ہے۔ ادھر شمال میں کبیر ہے کہ جس کے دوہوں میں بھاشا اور سنسکرت دونوں مل کر اردو کی ایک اور صورت منظر عام پر لاتی ہیں۔ اس زبان میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا منتر بھی

ہے۔پس اُردو کو پنجاب سے آنے والے مسلمانوں کی زبان سمجھنا محض ایک سیاسی نظریے کی ضرورت ہے۔

مولوی عبدالحق نے مذکورہ اُردو زبان کی ابتدا سے متعلق سیاسی نظریات کو اپنی کتاب ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں ترتیب دیا تھا۔جس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان پر مسلمان حملہ آوروں کی آمد کے ساتھ ہی خصوصاً پنجاب کی فتح کے بعد صوفیائے کرام بھی رشد وہدایت کا پیغام لے کر سرزمین ہند میں وارد ہوگئے،ان صوفیا کی زبان عربی،فارسی یا ترکی تھی۔لیکن انہوں نے اپنے پیغام کو عوام تک پہنچانے میں عوامی زبانوں سے کام لیا اور یوں اُردو کی ابتدائی صورت ان صوفیاء کی بعض تحریروں میں منظر عام پر آنے لگی۔مولوی صاحب نے بھی اِن صوفیا کے اُردو نما تحریروں کے ٹکڑوں کو ایسا برتر اور افضل جانا کہ مقامی زبانوں کی سماجی اور ثقافتی سطح پر موجود شناخت کا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی اور نہ ہی ان زبانوں کی ارتقائی شکلوں کا موازنہ صوفیاء کی تحریروں سے کیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی زبانیں جو صد ہا سال سے لوگوں کی سیاسی،سماجی،معاشی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کر رہی تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے اُردو کے ان چند ٹکڑوں میں کہیں بہت نیچے دب کر رہ گئیں۔ایسا مولوی صاحب کی نظریاتی ضرورت کے تحت ہوا ہے۔یہ بات اُن کے سیاسی مقاصد میں شامل تھی۔''داستان تاریخ اُردو'' کے مؤلف حامد حسن قادری نے بھی مولوی عبدالحق کے اِسی سیاسی نظریے کو اپنایا یعنی وہی مسلمانوں کے مقبوضات میں اُردو زبان کے فروغ کی کہانی:

> مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور نئی مخلوط زبان (اُردو) کو ترقی ہوتی رہی۔ مسلمان اب تک اپنی بول چال خط وکتابت وغیرہ کے لیے فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے لیکن بوقتِ ضرورت اہل ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اُردو) میں معاملہ کرتے تھے۔(۱۰)

حامد حسن قادری نے اپنی کتاب میں یہ بجا طور پر کہا ہے کہ اُردو زبان کی ابتدا میں صوفیائے کرام نے نمایاں کردار ادا کیا اور انہوں نے نورِ باطن سے اہل ہند کو روشن کرنے کے لیے مقامی زبانوں یا ان کے بقول ہندی الفاظ میں فیض پہنچایا لیکن اُنہوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ نئی مخلوط زبان مقامی زبانوں کے تارمیل سے اپنے وجود کی تکمیل کر رہی تھی اور اُس زبان میں فارسی،عربی اور ترکی کے الفاظ محض الفاظ کی حد تک شمولیت اختیار کر رہے تھے یا فاتح قوم کی مادری زبان میں مقامی زبانوں کے الفاظ محض الفاظ کی حد تک شمولیت اختیار کر رہے تھے؟ ظاہر ہے کہ موخر الذکر مخلوط زبان کی صورت خال خال ہی پیدا ہوئی،اس کی چند مثالیں بھی موجود ہیں لیکن ہمہ گیر سطح پر اوّل الذکر صورت نے مخلوط زبان کی تشکیل میں حتمی کردار ادا کیا۔ گویا اُردو ہندوستان ہی کی مقامی زبان تھی کہ جس میں فاتح قوم کی زبان کے الفاظ بھی شامل ہوگئے۔مسلمان فاتحین کی مادری زبان دربار سرکار کی غلام گردشوں ہی میں بھٹکتی رہ گئی۔اس زبان نے مقامی زبانوں کی چھوت چھات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے لے کر غالب اور اقبال تک دونوں زبانوں سے آشنا شعراء نے اپنے اُردو اور فارسی کے دیوان کو الگ الگ مدون کیا۔ان دونوں میں اگر کوئی تہذیبی،تمدنی اور ثقافتی سطح پر لسانی وحدت کا امکان ہوتا تو ہندوستان میں کم از کم اردو فارسی کے لسانی اختلافات کا جھگڑا پیدا ہی نہ ہوتا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام میں آئی، اس حوالے سے اُنہیں اُردو زبان و ادب کا جدید ترین محقق ہونے کا اعزاز حاصل ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُنہوں نے بھی انھی تحقیقی اُصولوں، طریقہ کار اور نظریات کو اپنایا ہے کہ جنہیں اُن سے پیشتر حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اختیار کیا تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُردو زبان و ادب کے ارتقاء کے حوالے سے کوئی نیا نظریہ قائم نہیں کیا بلکہ مخصوص سیاسی نظریے ہی کے تسلسل کو اپنی تحقیق میں جوں کا توں اپنا لیا ہے۔ اپنے ہم عصر اور پیش رووں سے اختلاف کی جرأت کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اُنہوں نے بھی مسلم حملہ آوروں کی تاریخ بیان کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے جیسے مسلمانوں کا لشکر پنجاب اور دلی کو فتح کرتا ہوا جنوب کی طرف بڑھتا چلا گیا اُردو زبان بھی تشکیل کے مدارج طے کرتی چلی گئی۔ وہ بھی اُردو زبان کے ارتقاء کو مسلمانوں کی فوجی مہمات کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں:

> غزنوی عہد کے پنجاب کی زبان لاہوری (پنجابی) تھی جو پورے علاقے کا ذریعۂ اظہار تھی۔ اس زبان پر ایرانی فتوحات اور حملوں کے بعد نئے لسانی اثرات مزید بڑھنے لگے تھے اور جب ۱۰۲۱ء میں غزنوی دور میں لوہور مرکز قرار پایا تو یہ اثرات مزید گہرے ہوتے ہوئے ایک نیا لسانی عمل ظاہر کرنے لگے۔ ترکی، عربی، فارسی، پنجابی اور مقامی اپ بھرنش کے باہمی ملاپ سے زبان کا ایک ایسا اسلوب تیار ہونے لگا جو مقامی آبادی اور نئے آبادکاروں کے لیے نیا ذریعۂ اظہار تھا۔ اس کی ابتدائی ساخت میں طویل مدت صرف ہوئی۔ پنجاب پر غزنوی حکومت کے قیام ۱۰۲۱ء سے لے کر دلی کی فتح ۱۱۹۳ء تک یہ عمل جاری رہا۔ (۱۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس کے بعد کچھ آگے بڑھتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کے مؤقف کی تائید کرتے ہوئے اپنے سیاسی نظریے کو واضح کر دیتے ہیں:

> یہ زبان فوجی مہمات ہی کے نتیجے میں نقل لسانی پر مجبور ہوئی اور لاہور سے دلی پہنچی۔ اس کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عہد سلاطین کی فوجی مہمات کے نتیجے میں یہ زبان شمال سے جنوب کی سمت سفر طے کرتی ہے۔ سلطانی دور میں جنوب کی طرف مہمات کا آغاز عہد خلجی میں ہوتا ہے۔ (۱۲)

غرض ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے عہد حاضر کی جدید ترین اردو ادب کی تاریخ تصنیف کرنے کے باوجود نئے مقدمات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خصوصاً سیاسی تبدیلیوں کے اثرات سماجی اور معاشی سطح پر عوامی زندگی پر کیسے پڑتے ہیں اور زبانیں ان سے کس قدر متاثر ہوتی ہیں، اس حوالے سے نتائج مرتب نہیں کیے۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر میں انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحات کے اُردو زبان میں در آنے سے اردو زبان اپنی بنیادی ساخت میں تبدیل نہیں ہوئی، وہ اردو ہی ہے۔ اِسی طرح ہندوستان کے شمال اور جنوب کے مختلف علاقوں میں جو ہندی، ہندوی، کھڑی بولی یا برج بھاشا موجود تھی، اُس کا بنیادی لسانی ڈھانچہ بھی موجود تھا۔ بننے، سنورنے اور نکھرنے کا عمل اس زبان میں بھی صدہا سال سے موجود تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ عمل کہیں رکا ہوا نہیں تھا۔ تاریخ کے چند سیاسی وقوعات کسی نئی زبان کی پیدائش کا سبب نہیں بن جاتے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہوتا

ہے۔ زبان کا رسم الخط ایک اور معاملہ ہے جبکہ زبان کا عوام کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں گھل مل کر رہنا اور بسنا دوسرا معاملہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جن مقامی لوگوں نے سیاسی وجوہات یا صوفیائے کرام کی اعلیٰ تعلیمات کے باعث اسلام قبول کیا اور ترک، ایرانی اور عرب مسلمان جو اپنی زبانوں کو لے کر یہاں پہنچے وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں گھل مل گئے، حکمران طبقات، نے اپنے غیر ملکی لسانی تشخص کو برقرار رکھا جبکہ عوامی طبقات نے عوامی زندگی میں گھل مل کر اپنی لسانی شناخت کو مقامی زبانوں میں ضم کر دیا۔ صوفیاء کے اقوال اور ان کے تصوف کے مضامین پر مبنی رسائل کی زبان اس بات کا قوی ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تحقیق میں بھی ان نکات کی طرف توجہ نہیں ملتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء سے متعلق کوئی نظریہ نہیں ملتا، تاہم انہوں نے اس جانب توجہ ضرور دلائی ہے کہ اُردو زبان کا نام اردو عہد بہ عہد کیوں بدلتا رہا:

> شیکسپئر کے بقول نام میں کیا رکھا ہے لیکن اُردو کے معاملہ میں یہ درست نہیں کیونکہ مختلف ادوار میں اردو کے نام بدلتے رہے یہی نہیں بلکہ ہر عہد کا نام بعض لسانی اور تہذیبی خصوصیات کا مظہر بھی رہا۔ یوں یہ نام بعض اوقات اس مخصوص عہد کے لیے ایک بلیغ استعارہ بھی بن جاتے ہیں۔ (۱۳)

ملتانی، لاہوری، گجری، دکنی، ریختہ، اُردوئے معلیٰ غرض مختلف نام اردو کے لیے موسوم رہے ہیں۔ علاقائی اور ثقافتی اہمیت کے اعتبار سے ان ناموں کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اُردو ادب و زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اس سے خوب آشنا ہیں لیکن سب سے زیادہ اہمیت اس کے ابتدائی نام 'ہندی' یا 'ہندوی' کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس ابتدائی نام سے متعلق تاریخی شواہد کو مختصر ترین الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

> حافظ محمود شیرانی سے لے کر ڈاکٹر سینتی کمار چیڑ جی تک لسانی محققین کی اکثریت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی نسبت اسے ''ہندی'' یا ''ہندوی'' کہا جاتا رہا ہے۔ اس نام کی شہادت قدیم لغات اور ادبی تصنیفات سے بھی ملتی ہے چنانچہ ۱۸۱۲ء میں قاضی خان بدر سے لے کر ۱۷۴۳ء میں سراج الدین خان آرزو تک سبھی قدیم لغت نویسوں نے ہندوستان کی زبان کو ''ہندی'' یا ''ہندوی'' لکھا ہے۔ (۱۴)

غرض اردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی ہی تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دربار کی زبان فارسی کے مقابلے میں اس کی اپنی ہمہ گیر امتیازی شناخت تھی۔ اسی ہمہ گیریت کے سبب اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ یہ شمال سے لے کر جنوب تک پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جا رہی تھی اور بلا تفریق رنگ، نسل اور مذہب کے عوام اسے روزمرہ زندگی میں استعمال کر رہے تھے۔ یہ نام خود اس معنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس زبان کو کسی مخصوص مذہب یا نسل کے ساتھ منسوب نہیں کیا گیا۔ اس زبان کی یہ حیثیت برصغیر پاک و ہند میں آج تک برقرار ہے۔ شاہ جہاں نے اس کا نام 'اردو' سیاسی مصلحت کے تحت نہ بھی رکھا ہو پھر بھی ہندی اور اردو کو ایک تنازع کی شکل دے کر سیاسی مسئلہ کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ 'اردو' قدیم ہندی یا ہندوی کے لیے ایک بہت خوبصورت نام ہے، دلوں کو بھاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ سرحد کے اُس پار جو اسے نام دیا گیا

ہے وہ ہماری تہذیبی قدروں کے منافی ہے۔ سیاسی مصلحتوں کے تحت وہ یا ہم اگر ایسا سمجھتے ہیں تو اِدھر یا اُدھر کی جمہور سے آخر کس انسانی تعلق کی بات کرتے ہیں؟ ہم گیت لتا منگیشکر کا سنیں یا مہدی حسن کا ہمیں کہنا پڑے گا بقول شیکسپئر ''نام میں کیا رکھا ہے''۔ ہندی ہو یا اُردو برصغیر پاک وہند کی مشترکہ لسانی شناخت ہے۔ دونوں نام مستعمل ہیں اور بھلے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، مقتدرہ، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۸

۲۔ ایضاً ص: ۷

۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، غضنفر اکیڈمی کراچی، سن ندارد ص: ۲۵

۴۔ ڈاکٹر محی الدین زور، ہندوستانی لسانیات، پنجند اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء ص: ۱۱۶

۵۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۸ء، ص: ۴۰

۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، جلد اول مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۸

۷۔ ایضاً ص: ۲

۸۔ ایضاً ص: ۱۰

۹۔ عین الحق فرید کوٹی، اُردو زبان کی قدیم تاریخ، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۸۰

۱۰۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۶

۱۱۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اُردو ادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۰

۱۲۔ ایضاً ص: ۲۳

۱۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۴

۱۴۔ ایضاً ص: ۱۴